باہر سے آنے والے انگریز جو پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے شاہ جہاں کے زمانے میں ہندوستان آکر تجارت کرنے لگے تھے، اس فکر میں تھے کہ اپنی عیاریوں اور مکاریوں کے ذریعہ مسلمانوں کی حکومت کو کمزور کردیں۔ ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکائیں اور مسلمان امیروں کو بھی بہکا کر اپنی چالبازیوں کے دام میں پھانس لیں اور اس طرح پورے ملک میں سیاسی ابتری پھیلا کر اپنی حکومت قائم کرلیں۔

یہ تو انگریزوں کی بات تھی جو سات سمندر پار سے تاجر بن کر آئے تھے اور حاکم بننے کی کوشش کررہے تھے لیکن اندرون ملک بھی مغل حکومت کے دشمن کم نہیں تھے۔ اس زمانے میں جب پنجاب، سندھ، صوبہ متحدہ آگرہ، اودھ اور دکنی ہندوستان کے تمام علاقے مغل حکومت میں شامل تھے، جو اورنگ زیب عالم گیر کے ہاتھوں مغلوں کے زیرنگیں آئے تھے۔ اس وقت مغلیہ خاندان کا آخری طاقت ور حکمراں اورنگ زیب عالم گیر کو ہی سمجھا جاتا تھا۔ اورنگ زیب کے بعد مغلیہ خاندان کے اور بھی کئی بادشاہ ہوئے لیکن ان میں اورنگ زیب جیسی خوبیاں نہیں تھیں۔ اس لیے رفتہ رفتہ مغلیہ حکومت کمزور ہوتی چلی گئی۔ انگریزوں کی سازش کے علاوہ اس صورت حال کی دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ ہندوستان میں حکومت مخالف طاقتیں خفیہ طور پر سازش کررہی تھیں۔ مغل دربار کے کچھ مسلمان امیر جو لالچی اور اخلاقی طور پر بہت کمزور تھے، دشمنوں کی چالبازیوں میں پھنس گئے اور اپنے ذاتی مفاد کے لئے مغلیہ سلطنت کو نقصان پہنچانے لگے۔ بہت سے مسلمان جھوٹی اور بُری باتوں میں پڑ کر اسلام کے سچے اور آفاقی اصولوں کو بھولتے جارہے تھے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مغلیہ سلطنت میں رفتہ رفتہ کمزوریاں اور خرابیاں بڑھتی چلی گئیں۔

مغل حکمراں اپنی سیاسی اور اخلاقی کمزوریوں کی وجہ سے بیک وقت خارجی اور داخلی سازشوں کا مقابلہ نہیں کرسکے اور سارے ملک میں خانہ جنگی کی کیفیت پیدا ہوگئی اور ملک سیاسی افراتفری کا شکار ہوگیا۔ اس صورت حال کا فائدہ اٹھا کر انگریز علاقائی سطح پر اپنی طاقت بڑھاتے رہے۔ پہلے تو یہ انگریز چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے نوابوں اور راجاؤں کو ایک دوسرے کے خلاف ورغلاتے اور انہیں آپس میں لڑادیتے اور جس فریق کا پلہ بھاری دیکھتے اس کی طرف سے مدد کرنے کے بہانے خود ہی شریک ہوجاتے۔ اس طرح فاتح فریق سے اپنی ہمدردی کی قیمت کچھ علاقوں کی شکل میں وصول کرتے۔ اسی طرح انگریزوں نے ہندوستان کے بہت سے علاقوں پر رفتہ رفتہ قبضہ کرلیا۔ مسلمانوں کی سیاسی طاقت کو انگریزوں نے کئی ٹکڑوں میں تقسیم کردیا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی سیاسی مرکزیت کمزور

ہوگئی۔

ظاہر ہے کہ جب کوئی مرکزی قوت ٹوٹ کر الگ الگ بکھر جاتی ہے تو اس میں خود بخود کمزوری پیدا ہونے لگتی ہے۔ چنانچہ مغلوں کی حکومت اور مسلمانوں کی سیاسی طاقت ہندوستان میں کمزور ہوتی چلی گئی۔ صوبائی و علاقائی سطح پر کہیں انگریزوں نے ہم وطنوں سے قبضہ کروایا اور کہیں خود آگے بڑھ کر اپنے قبضہ میں لے لیا۔ کہیں سکھوں اور مرہٹوں کی حکومت قائم کروائی اور پھر ملک کو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے خود پورے ملک پر قبضہ کرلیا۔

ان حالات میں مغل حکمرانوں کی کمزوری اور مسلمانوں کی عام ذہنی، اخلاقی اور تعلیمی پستی کا جائزہ لے کر اس وقت جو رہنما قیادت کے لئے منظر عام پر آئے اور جنہوں نے انگریزوں کے خلاف قوم کے اندر مخالفت کا جذبہ پیدا کیا اور ہندوستانیوں کو انگریزوں کے بڑھتے ہوئے سیاسی اثرات اور ان کے فتنے سے واقف کرایا۔ ان میں سب سے آگے شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے خاندان کے بزرگ عالم اور شاگرد، شاہ اسمٰعیل شہیدؒ، سید احمد بریلوی شہید اور حافظ رحمت خان شہید وغیرہ تھے۔ ان حضرات نے خاص طور پر مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی اور انہیں روحانی و اخلاقی تعلیم کا پیغام دیا اور یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر اس وقت ہم لوگوں نے ہمت و حوصلہ سے کام نہیں لیا تو ہمیشہ کے لیے انگریزوں کے غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیے جائیں گے اور ہمیشہ ان کے ظلم و ستم کا شکار بنے رہیں گے۔ مگر اب پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا اور انگریز زیادہ طاقت ور ہو چکے تھے۔ اس لیے ان مصلحین حضرات کو انگریزوں کی قوت اور سازش کی وجہ سے شکست سے دوچار ہونا پڑا۔

ABDUL ... PATNA

مشقی سوالات

1. مغلیہ سلطنت کے زوال کے اسباب پر روشنی ڈالیے۔
2. ہندوستان میں انگریزوں کی آمد اور اس کی پالیسی کی وضاحت کیجیے۔

انقلاب 1857

جب مغلیہ حکومت آخری سانسیں لے رہی تھی اور انگریزوں کا غلبہ اور سیاسی تسلط رفتہ رفتہ بڑھتا جا رہا تھا تو اس وقت مغلیہ خاندان کے آخری چراغ بہادر شاہ ظفر تخت سلطنت پر متمکن تھے۔ وہ ہندوستان کے سیاسی حالات کا بغور جائزہ لے رہے تھے اور مغلوں کے زوال پذیر مستقبل سے بھی واقف تھے مگر بوڑھے ہو چکے تھے فوج کم تھی حکومت کا خزانہ خالی تھا۔ اس پیرانہ سالی کے باوجود ان کی غیرت جوش میں آئی لیکن سیاسی طور پر مجبور محض تھے اس لیے کچھ کر نہ سکے۔

1856ء کا زمانہ جب انگریز ہندوستان کے چاروں طرف رفتہ رفتہ اپنا قبضہ جماتے جا رہے تھے اور مغلیہ خاندان کی حکومت کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ علما و فضلاء حضرات نے غیروں کے ہاتھوں ہندوستان کی آزادی چھنتے دیکھ کر ہندوستانیوں کو آخری بار للکارا اور طاقت کو جمع کر کے انگریزوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمت بڑھائی۔ ہندوستانی قوم جن میں ہندو مسلمان سبھی شامل تھے ان کی غیرت کو بھی جوش آیا اور اپنے وطن کی آزادی کے لیے مر مٹنے کو تیار ہو گئے۔ اور انگریزوں کو ہندوستان سے باہر نکالنے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ پہلے میرٹھ اور دہلی کے سپاہیوں میں بغاوت کا شعلہ بھڑکا۔ پھر اس نے سارے یوپی کو اپنے دائرے میں لے لیا۔ رفتہ رفتہ یہ آگ ملک کے دوسرے حصوں میں پھیلنے لگی۔ یہ ایسا انقلاب تھا جس نے انگریزوں کے ہوش اڑا دیئے لیکن انگریزوں نے کمال عیاری کے ساتھ اسے غدر کا نام دے دیا۔

مغل حکمرانوں کا برتاؤ چونکہ تمام باشندگان ہند کے ساتھ مساوات کا تھا اس لیے آزادی کی اس لڑائی میں سکھوں کو چھوڑ کر تمام فرقوں نے مجاہدین کا ساتھ دیا۔ سکھ انگریزوں کے حامی تھے۔ مگر آزادی کی یہ لڑائی زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکی۔ کیونکہ انگریزوں نے دولت اور طاقت کا استعمال کر کے بہت سے دیسی اور علاقائی حکمرانوں اور ضمیر فروشوں کو خرید لیا تھا۔ ان غدار حکمرانوں نے اپنے بادشاہ، اپنے وطن اور آزادی کے متوالوں سے

غداری کی اور انگریزوں کے ساتھ ہو گئے۔ انگریزوں نے ہندوستانی عوام اور بادشاہ کو بدنام کرنے کے لیے جھوٹی باتیں گڑھنا شروع کر دیں جو آگے چل کر ان کی من گھڑت تاریخ کا حصہ بن گئیں جیسے اورنگ زیب جیسے لائق، محنتی، وطن دوست اور باصلاحیت حکمراں کو متعصب اور ہندوؤں کا دشمن قرار دیا گیا جو تاریخی لحاظ سے بالکل غلط ہے۔

غدر کرنے والے تو دراصل انگریز اور غدار ہندوستانی حکمراں اور ان کے ساتھی تھے جنہوں نے ہماری آزادی سلب کرنے کے لیے اور اپنے ذاتی مفاد کے لیے وطن پرست مغل بادشاہ سے غداری کی۔ مگر انگریزوں نے اپنی مکاریوں اور عیاریوں سے اور دولت اور ہتھیار کے بل بوتے پر مسلمانوں کی مذہبی قوت کو کمزور کرنا شروع کر دیا اور ہندو مسلمانوں کو بھی آپس میں خوب لڑایا اور آخر کار پورے ہندوستان کو اپنا غلام بنالیا۔

ہندوستان کی تاریخ نے ایک نیا دور دیکھا۔ آزادی کی اس پہلی لڑائی میں ہندوستانیوں کو شکست ہوئی اور انگریز فتح یاب ہوئے۔ اب ہندوستان پر انگریزوں کا مکمل سیاسی تسلط ہو گیا۔ ٹیپو سلطان، نواب سراج الدولہ اور بہادر شاہ ظفر سھوں نے انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے اور ملک کو آزاد کرانے کے لیے بے مثال قربانیاں دی تھیں۔ ان قربانیوں کے ساتھ ہندوستان کے کچھ غدار لوگوں نے انگریزوں کے ہاتھ مضبوط کرنے اور اپنے بھائیوں کو غلام بنانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 1857ء کا انقلاب ناکام ہو گیا اور اپنے لوگوں کی غداریوں کی وجہ سے ہندوستان پر انگریزوں کا سیاسی تسلط مسلم ہو گیا اور ہندوستانی پورے طور پر انگریزوں کے غلام بن گئے۔

1857ء کے انقلاب کی ناکامی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی حالت بہت خراب ہونے لگی۔ چونکہ انگریزوں نے حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی اس لیے انگریزوں کے مظالم کے زیادہ تر شکار مسلمان ہی ہوئے۔ دوسری بات یہ تھی کہ مسلمانوں میں غربت اور جہالت زیادہ تھی۔ اس لیے ان کی حالت زیادہ پست تھی اور غلامی کی پستی نے ان کے دل و دماغ کو بھی نکما کر دیا تھا۔ مسلمانوں میں کچھ ایسے بھی تھے جو دولت اور جاگیر کی لالچ میں انگریزوں کی خوشامد میں مصروف تھے۔ مسلمانوں میں تیسری جماعت تھی مذہبی جماعت۔ ان میں بھی دو گروہ تھے۔ اور ان دونوں میں نظریاتی اختلاف موجود تھا۔ جس کی وجہ سے اس جماعت کی قوت بھی منتشر ہو چکی تھی۔ ایک گروہ

ایسے تعلیمی نظام (Educational System) کا طرفدار اور مبلغ تھا جو روایتی اور فرسودہ تھا۔ اس وجہ سے اسلام کی سچائی یا مذہب کی اصل حقیقت کا سمجھ پانا مشکل تھا۔ اس کے برخلاف دوسرا گروہ مسلمانوں کو اس نئے تعلیمی نظام سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ جسے انگریزی حکومت کی تعلیمی پالیسی کے تحت قائم کیا گیا تھا۔ اس میں مصلحت یہ تھی کہ مسلمانوں کو انگریزی حکومت اور انگریزی تہذیب وتمدن کے اثرات سے دور رکھا جاسکے۔ یہ کوشش دراصل آزادی کے نوخیز پودے کو بارآور اور ثمربار بنانے کی مصلحتوں پر مبنی تھی۔ تاکہ انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لیے پھر ایک بار بھرپور کوشش کی جاسکے۔ اس منصوبے کے تحت جو عملی قدم اٹھایا گیا آگے چل کر اس کے کچھ فائدے ضرور سامنے آئے۔

مختصر یہ کہ 1857ء کے انقلاب کو دو سال کی قلیل مدت میں انگریزوں نے اپنی روایتی عیاریوں اور چال بازیوں سے کچل ڈالا۔ زمینداروں اور جاگیرداروں کی غداری کے سبب اس عوامی بغاوت کو دبانا آسان ہوگیا۔ اپنے طبقاتی مفاد کی خاطر انہوں نے اپنی آزادی کو قربان کردیا۔ یہاں تک کہ دیسی وعلاقائی حکمرانوں میں سے کسی نے بھی اس بغاوت میں شرکت نہیں کی کیونکہ لارڈ کیننگ نے سچے دل کے ساتھ انہیں متبنیٰ بنانے کے دائمی حق کی ضمانت دے دی۔ 339 راجاؤں اور رانیوں میں سے صرف جھانسی کی لکشمی بائی نے انگریزوں کے خلاف لڑکر اپنی جان قربان کردی۔ اگرچہ وہ بھی کچھ تاخیر سے ہی 1858ء میں انگریزوں کے خلاف میدان جنگ میں کودیں۔

1857ء کے انقلاب کی ناکامی کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں کو خاص طور سے اپنے مظالم کا نشانہ بنایا۔ یہاں تک کہ کئی مقامات پر ساری مسلم آبادی کو قتل کردیا گیا۔ تمام شمالی ہندوستان میں علماء اور رہنماؤں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر گرفتار کیا گیا اور پھانسی دے دی گئی۔ ان میں سے سینکڑوں ممتاز علماء کو توپوں سے اڑا دیا گیا۔ بہتوں کو ملک بدر کرکے انڈمان نکوبار کے ویران جزائر میں بھیج دیا گیا۔

ہندوستانی معاشرے پر اس ناکامی کا لازمی اثر یہ ہوا کہ انگریزی رہن سہن، زبان اور ان کی ولایتی چالیں ان کی حکومت کے ساتھ ہمارے ملک میں رواج پانے لگیں۔ تاریخی حقائق کو بدلا جانے لگا۔ جھوٹی کہانیوں کے ذریعہ مسلم حکمرانوں کو بدنام کرنے کی کوشش کی گئی۔ غیروں کی حکومت، غیروں کے مدرسے، غیروں کی رہائش اور غیروں کے رنگ میں رنگتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ہم اپنی تہذیب وثقافت اور مذہبی روایات کو بھی بھول گئے۔

ABSOL SOLUTIONS

ملک میں بہت سے مسلمان ایسے بھی تھے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہوئے شرماتے تھے اور اپنے دین و مذہب کو انگریزوں کی غلامی سے کم تر سمجھنے لگے تھے۔

مشقی سوالات

1. کیا انقلاب 1857ء انگریزوں کی سازش کا نتیجہ تھا۔ وضاحت کیجیے۔
2. انقلاب 1857ء کے اسباب پر روشنی ڈالیے۔

تعلیمی اور سماجی تحریکیں

1857ء کے انقلاب کی ناکامی کے بعد ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط پورے طور پر قائم ہوگیا۔ ہندوستانی لوگ انگریزوں کے غلام ہوگئے۔ اب ہندوستانیوں پر فاتح قوم کی حیثیت سے انگریزوں کے مظالم اور استحصال کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ انگریزوں نے چونکہ حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی۔ اس لیے ان کے مظالم کا نشانہ بھی زیادہ تر مسلمان ہی بنے۔ مسلمان سیاسی، اقتصادی، تعلیمی، سماجی گویا زندگی کی ہر سطح پر پست ہوتے گئے۔ ان پر مایوسی اور بددلی کی کیفیت طاری ہوگئی۔ مسلمانوں کے برخلاف برادران وطن نے بدلتے ہوئے حالات کے تقاضے کو سمجھ لیا اور برابر نئی تعلیم کی تلاش وجستجو میں مصروف رہے۔ ہندوستان کے تمام فرقوں میں تعلیمی اور سماجی تحریکیں پنپنے لگیں۔ سکھوں اور اکالی رہنماؤں کی طرف سے سکھوں کی فلاح و بہبود کے لیے کئی سماجی اور تعلیمی تحریکیں چلائی گئیں جن کا خاطر خواہ فائدہ ہوا۔

ہندو فرقے میں بھی راجا رام موہن رائے اور سوامی وویکا نند جیسے مصلحین منظر عام پر آئے اور روایتی میں مذہبی دقیانوسی عقائد وتصورات کو دور کرنے کے لیے سماجی تحریکیں چلائی گئیں جن کے نتیجہ میں ستی جیسے الم ناک رواج کو ختم کیا گیا اور ہندو مذہب میں بہت سی اصلاحات رونما ہوئیں۔

مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کا زمانہ بھی زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہا۔ غدر 1857ء کے ایک عشرہ کے بعد ہی سرسید احمد خاں منظر عام پر آئے اور مسلمانوں کی سماجی اور تعلیمی پستی کا اندازہ لگایا۔ سرسید کے ساتھ ان کے رفقائے کار جیسے حالی، شبلی، ڈپٹی نذیر احمد، نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک جیسی شخصیات نے مسلمانوں کو بدلتے ہوئے حالات سے باخبر کیا اور تعلیم کی افادیت واہمیت کو واضح کرتے ہوئے ان کو حصول تعلیم کی طرف متوجہ کیا۔ سرسید نے مسلمانوں پر سب سے بڑا احسان یہ کیا کہ مذہب کے نام پر پھیلائی جانے والی جہالت کے خلاف عوام بالخصوص مسلمان کو ہوشیار و بیدار کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ انہوں نے جہاں مادّی، عقلی یا سائنسی علوم

کی اہمیت کا احساس دلایا وہیں مذہب کی حقیقت و اہمیت کی طرف بھی توجہ مبذول کرائی۔ چنانچہ مذہبی امور میں بھی تدبر و تفکر کی ایک نئی روش قائم ہوئی۔

سرسید کی ان مخلصانہ کوششوں سے مسلمانوں کو بہت سہارا ملا۔ وہ اب پستی کے گڈھے سے رفتہ رفتہ نکلنے لگے۔ سرسید نے 1875ء میں مسلمانوں کی تعلیم کے لیے علی گڑھ میں 'مدرسۃ العلوم' نام سے ایک ادارہ قائم کیا پھر اس ادارے کو ترقی دے کر 1877ء میں 'محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (ایم۔اے۔او کالج) بنا دیا اور اپنے رفقائے کار حالی، شبلی، نذیر احمد، محسن الملک اور وقار الملک کی مدد سے مسلمانوں میں نئی زندگی کی لہر دوڑا دی۔ اگرچہ مسلمانوں کے بعض طبقوں کی طرف سے سرسید کو شدید مخالفت کا بھی سامنا کرنا پڑا یہاں تک کہ نام نہاد مفتیوں کی طرف سے ان پر کفر کا فتویٰ بھی لگایا گیا۔ مگر سرسید اور ان کے رفقائے کار کی ثابت قدمی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ 1920ء میں برٹش گورنمنٹ نے ایم۔اے۔ او کالج کو یونی ورسٹی کی حیثیت عطا کردی جو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے نام سے مشہور ہوا۔ یونی ورسٹی کے قیام کے بعد مسلمانوں کے لیے اعلیٰ تعلیم کے دروازے کھل گئے۔ دیگر تمام برادران وطن نے بھی اس ادارے میں داخلہ لیا اور بلا امتیاز مذہب وملت اس ادارے نے خدمات انجام دیں۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کا قیام تمام اقوام کے لئے روشنی کا مینار ثابت ہوا۔ یہ روشنی ملک بھر میں پھیلتی چلی گئی۔ اب اس علمی مرکز سے تعلیم حاصل کر کے روشن دماغ نوجوانوں کی ایک جماعت نکلی جس نے نہایت خلوص کے ساتھ قوم کی سیاسی رہنمائی کی، جن میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، نواب وقار الملک، نواب محسن الملک، نواب سرسلیم اللہ، سر آغا خان، محمد علی جناب سر محمد شفیع، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، نواب محمد اسمٰعیل خاں، خواجہ ناظم الدین، حسین شہید سہروردی، نواب زادہ لیاقت علی خاں، آئی آئی چندریگر اور سردار عبدالرب نشتر و دیگر حضرات شامل ہیں۔ ابتدائی دور میں یہ جماعت مسلمانوں کی تعلیمی اور سیاسی تعمیر میں مصروف رہی لیکن بعد میں چند مسلمان حضرات نے اپنے اپنے سیاسی راستے الگ بنائے وہ برادران وطن کے ساتھ جا ملے۔ بقیہ تمام لوگوں نے شروع سے آخر تک قدم قدم پر قوم پرست لوگوں کا ساتھ کا ساتھ دیا اور طرح طرح کی قربانیاں دے کر جدوجہد آزادی کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ ان رہنماؤں کے ساتھ جو لوگ ملک کی آزادی کی لڑائی میں قدم قدم پر سینہ سپر رہے ان میں محمد علی جناح، مولانا حسرت موہانی، لیاقت علی خاں اور علی برادران کا سیاسی قومی مرتبہ ثابت قدمی کے لحاظ سے نہایت بلند رہا ہے۔

اس جماعت میں ان مسلمانوں کی کثرت تھی جنھوں نے ملک کو انگریزوں کی غلامی سے چھڑانے میں تن من دھن کی بازی لگادی اور سیاست کے میدان میں پوری قوم کی ر ائی کرتے ہوئے جنگ آزادی کے لیے اپنی اپنی زندگی وقف کر دی۔

1857ء کے ناکام انقلاب کے بعد انگریزوں اور ان کے غیر ملکی اثرات نے اپنی سیاسی قوت کو ہندوستان میں مستحکم کرنے کے لیے اور اس ملک کو لوٹ کھسوٹ کر غریب بنانے کے لئے ہندوستان کے مسلمانوں کو سب سے زیادہ کچلا۔ اس طرح آزادی کی خاطر ان مسلم رہنماؤں کو تین محاذوں پر سیاسی لڑائیاں لڑنی پڑیں۔

پہلی لڑائی انگریزوں کے خلاف لڑنی پڑی جو 1947ء تک مسلسل جاری رہی، دوسری لڑائی اپنے ہی ناسمجھ اور خود غرض بھائیوں کے ساتھ لڑنی پڑی جو جہالت کی وجہ سے اخلاقی پستی میں چلے گئے تھے۔ تیسری اور آخری لڑائی ان سیاسی و سماجی خدمت گاروں کو برادران وطن کے ساتھ لڑنی پڑی جسے شروع سے ہی خود مسلمانوں نے مضبوط بنایا۔ اور آخر کار اس فرقہ پرست طاقت نے ہمیں ہی مٹانے کی کوشش کی اور انگریزوں کی جگہ خود اس ملک کا مالک بن کر ہم کو غلام بنانے کا ارادہ کرلیا۔ کانگریس جیسی سیکولر پارٹی میں بھی بعض ایسے لیڈر موجود تھے جن کا فرقہ پرست طاقتوں سے قریبی تعلق تھا۔

سرسید نے بدلتے ہوئے حالات اور زمانے کے تقاضوں کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کو بتایا کہ ملک کے دیگر فرقے اب بھی مسلمانوں سے بہت آگے ہیں۔ وہ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ اب زمانہ بدل رہا ہے۔ ہمیں دوسری قوموں کی برابری کرنا ہے اور ان کا مقابلہ اسی وقت کر سکتے ہیں جب ہم نئے علوم سیکھیں۔ مسلمان اپنے دین کی تعلیم کے ساتھ ساتھ نئے علوم کو بھی سیکھیں۔ سرسید اور ان کے رفقائے کار نے ابتدا میں مسلمانوں کو انگریزوں کے ساتھ مل جل کر رہنے کی تعلیم دی تاکہ انگریز ان کے وجود کو ختم نہ کریں۔ مگر ساتھ ہی اپنی تعلیمی اور مذہبی روایات کو بھی زندہ رکھنے کی ہدایت کرتے تھے۔ سرسید کی اس سماجی اور تعلیمی تحریک کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان ہندوستان میں اپنے وجود کو باقی رکھ سکے۔

مشقی سوالات

1. سرسید کی علمی خدمات پر روشنی ڈالیے۔
2. ہندوستان میں سماجی اور تعلیمی تحریکات کا جائزہ لیجیے۔

انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد

انڈین نیشنل کانگریس کی تاریخ اور ہندوستان میں جدوجہد آزادی کی تاریخ کو ایک ہی سکّے کے دو پہلو سمجھنا چاہیے۔ یہ الگ بات ہے کہ جدوجہد آزادی کی تحریک کی بنیاد 1857ء کے انقلاب میں ہی پڑ چکی تھی۔ جس کو 1885ء میں تنظیمی شکل دی گئی اس تنظیم کا نام انڈین نیشنل کانگریس رکھا گیا۔ کانگریس کے قیام کے بنیادی محرک ایک انگریز افسر اے او ہیوم تھے۔ جن کا بنیادی مقصد اس تنظیم کے قیام سے یہ تھا کہ ہندوستانیوں کو برٹش گورنمنٹ کی طرف سے کچھ سہولیات مہیا کرائی جائے۔ مسٹر اے او ہیوم نے فطری شرافت اور انسانیت کی بنیاد پر ہندوستانیوں سے ہمدردی کی وجہ سے اس تنظیم کی بنیاد ڈالی۔ یہ دوسری بات ہے کہ وقت کے گذرنے کے ساتھ انڈین نیشنل کانگریس ہندوستانیوں کے مفاد کے لیے جلد ہی ایک تحریک کی شکل اختیار کرگئی۔ جدوجہد آزدی کی ایک علامت بن گئی اور بعد کے برسوں میں کانگریس نے ملک کی تاریخ میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ جدوجہد آزادی کی تاریخ میں کانگریس کی خدمات اور کارناموں کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

مارچ 1885ء میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ دسمبر میں ہندوستان کے تمام حصوں کے نمائندوں کا ایک عام اجلاس بلایا جائے۔ چنانچہ 28 ردسمبر 1885ء کو گوکل داس تیج پال سنسکرت کالج کے وسیع ہال میں ایک اجلاس منعقد کیا گیا۔ سب سے پہلے اے او ہیوم نے جناب ڈبلیوسی بنرجی کا نام اجلاس کی صدارت کے لیے پیش کیا۔ جس کو اتفاق رائے سے منظور کرلیا گیا۔ اجلاس کے صدر جناب ڈبلیوسی بنرجی نے اپنی صدارتی تقریر میں کانگریس پارٹی کے درج ذیل مقاصد بیان کیے۔

'راج کے مختلف حصوں میں ملک کے تمام پر خلوص کارکنوں کے درمیان قربت اور دوستی پیدا کرنا۔ براہ راست دوستی اور رابطوں کے ذریعہ تمام محبانِ وطن کے درمیان رنگ ونسل عقائد اور علاقہ واریت ہر قسم کی عصبیت دور کرنا اور ہمارے محبوب لارڈ رپن کے یادگار دورِ اقتدار میں پیدا ہونے والے قومی یک جہتی کے جذبات کو بھر پور

فروغ اور استحکام عطا کرنا۔'

صدر اجلاس مسٹر بنرجی کے اس بیان کے بعد اجلاس میں موجود دانشوروں کے درمیان ہندوستانیوں کے مسائل پر ایک مباحثہ ہوا۔ جو آج تاریخ کا ایک حصہ ہے اور رکارڈ میں ہے۔ اس اجلاس میں چند قرار دادیں منظور کی گئیں جو قومی اور تاریخی اہمیت کی حامل تھیں ان قرار دادوں سے ان قومی رہنماؤں کے اعلیٰ فکر و نظر کا پتہ چلتا ہے۔

ان قرار دادوں کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلی قرار داد میں رائل کمیشن سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ ہندوستانی انتظامیہ کے حقائق کی از سر نو تحقیق کرے۔ دوسری قرار داد میں مطالبہ کیا گیا کہ انڈین کونسل کو ختم کر دیا جائے۔ تیسری قرار داد میں نامزدگی کی بنیاد پر مشتمل کونسلوں پر سخت اعتراض کیا گیا۔ اس کے علاوہ دیگر ملکی مسائل پر بھی قرار دادیں پیش کی گئیں۔ چوتھی قرار داد میں ICS امتحانات میں امیدواروں کی عمر کے حدود میں اضافہ کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ پانچویں اور چھٹی قرار داد میں فوجی اخراجات میں کمی کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ ساتویں قرار داد میں برما کے ہندوستان میں انضمام پر سخت احتجاج کیا گیا۔ آٹھویں قرار داد میں سخت ہدایت دی گئی کہ گزشتہ تمام قرار دادوں پر سختی سے عمل کیا جائے اور پورے ملک میں کانگریس کی قرار دادوں کو متعارف کرانے کے لیے وفود بھیجے جائیں۔ آٹھویں قرار داد میں ہی یہ طے کیا گیا کہ کانگریس کا آئندہ اجلاس 28 ر دسمبر 1886ء کو کلکتہ میں ہوگا۔

اس طرح اس اجلاس کے سیاسی ڈھانچے کی بنیاد رکھ دی گئی۔ اس موقع پر قومی سطح کے رہنماؤں نے آپس میں طے کیا کہ متفقہ طور پر ایک ایسا فارمولا تیار کیا جائے کہ جس کے ذریعہ مختلف نوعیت کے قومی مسائل کو ترجیحی بنیاد پر حل کیا جاسکے۔ ایک فرق ضرور دیکھا گیا کہ کانگریس کے قیام کے وقت مکمل آزادی کا حصول، اس کے اغراض و مقاصد کی پالیسیوں میں شامل نہیں تھا۔ بلکہ کانگریسی رہنما تاج برطانیہ کے زبردست حامی تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ کانگریس پارٹی کے قیام میں اولین محرک ڈاکٹر اے او ہیوم انگریز ہی تھے۔ یہاں تک کہ کانگریس کے اجلاس میں برٹش گورنمنٹ کی حمایت کا برملا اظہار کیا گیا۔ کانگریسی رہنماؤں کا ایسا خیال تھا کہ برٹش گورنمنٹ کی سرکاری مشنری کے ساتھ قریبی تعلق رکھا جائے تاکہ سماج سے بے انصافی اور بدعنوانی کا خاتمہ ہوسکے۔ یہ رہنما چاہتے تھے کہ ملک کو معاشی آزادی حاصل ہو تاکہ عوام کی غربت دور ہو فوجی اخراجات میں کمی کر کے یہ مقاصد حاصل کئے

جاسکتے تھے۔

اسی ابتداء کے ساتھ کانگریس نے اپنا سیاسی سفر جاری کیا اور ہر سال ملک کے کسی نہ کسی شہر میں کانگریس کا اجلاس ہوتا رہا اور ملک کے وطن پرست قومی رہنما اپنے اپنے خیالات پیش کرتے رہے اور صلاح ومشورہ کرتے رہے۔ اس پارٹی کے پلیٹ فارم سے ان قومی رہنماؤں نے برٹش گورنمنٹ کو احساس دلایا کہ عوامی مفادات کو کس حد تک نظر انداز کیا جارہا ہے۔ کانگریس کے اس سیاسی سفر میں وقت کے گذرنے کے ساتھ گاندھی، نہرو اور مولانا آزاد جیسی شخصیت شامل ہوگئیں جن کی قومی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔

مشقی سوالات

1. آل انڈیا نیشنل کانگریس کی قومی خدمات پر روشنی ڈالیے۔
2. انڈین نیشنل کانگریس کی تاریخ بیان کیجیے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام

تحریک آزادیٔ ہند کی تاریخ قومی سطح پر کئی نشیب و فراز سے گذری۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں جدوجہد آزادی کے دوران ایک مرحلہ ایسا آیا کہ ہندوستان کے مسلمان جو شروع سے ہی اپنے ہندو بھائیوں کے شانہ بہ شانہ تحریک آزادی میں حصے لیتے آئے تھے۔1905ء میں مسلمان کانگریس پارٹی کے زیر سایہ گھٹن محسوس کرنے لگے۔ بنگال کی تقسیم کے معاملے میں مسلمانوں کے مفادات کو سخت نقصان پہنچا۔ ہوا یوں کہ 1905ء میں جب انگریزوں نے بنگال کی تقسیم کا فیصلہ کیا تو مشرقی بنگال کا حصہ ایسا تھا جہاں مسلمان اکثریت میں تھے اس لیے ملک کے ایک طبقہ کو بنگال کی یہ تقسیم ناگوار گذری۔ ایسے عناصر کانگریس میں بھی شامل تھے اور پارٹی کی منصوبہ سازی میں ان کا خاص عمل دخل رہتا تھا۔ کانگریس پارٹی میں بعض ایسے تھے جن کا ظاہر کچھ اور تھا اور باطن کچھ اور یعنی وہ دوہری شخصیت کے مالک تھے۔ مسلمانوں کے بعض قد آور لیڈروں کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ کانگریس پارٹی تمام تر قربانیوں کے باوجود مسلم مفادات کو نظر انداز کر رہی ہے۔

اس صورت حال کو محمد علی جناح، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی وغیرہ اچھی طرح سمجھ چکے تھے۔ رفتہ رفتہ اکثر مسلم لیڈران کو مذکورہ بالا عناصر کی یہ چال سمجھ میں آگئی۔ آخر کار مسلمانوں کے رہنما نواب وقار الملک نے یکم/اکتوبر1906ء کو وائسرائے ہند لارڈ منٹو کی خدمت میں ایک عرضداشت پیش کی جس میں مسلمانوں کی پوری حالت اور ان کے حقوق کی باتیں تفصیل سے بیان کی گئیں اور انہیں مسلمانوں کی شکایت سے خبردار کیا گیا۔ عرضداشت پیش کرنے والے اس وفد میں 35 مسلم لیڈران شریک تھے۔ جن میں سر آغا خان، نواب سر سلیم اللہ خان، نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

لارڈ منٹو نے اس عرضداشت کا جواب تو دیا لیکن الفاظ مبہم تھے اور ان میں ٹال مٹول کی باتیں کی گئی تھیں۔ اس وجہ سے مسلمان مطمئن نہیں ہو سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارے ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے رہنماؤں کے

مشورے سے یہ طے کیا کہ کانگریس چونکہ مسلمانوں کے مفاد کو پورا کرنے میں ناکام ہو چکی ہے اس لیے کانگریس سے الگ مسلمانوں کی ایک سیاسی جماعت قائم ہونا ضروری ہے۔ تا کہ ہم مسلمان اپنے مذہبی رسم و رواج کو از سرنو زندہ کر سکیں جسے مسلمانوں نے اپنی غفلت کی وجہ سے کھودیا ہے اور دوسرے کی چالبازیوں اور مکاریوں سے ان اسلامی روایات کو لٹنے نہ دیں۔

چنانچہ اس مقصد کی تکمیل کے لیئے 30 دسمبر 1906ء کو مشرقی بنگال کے ڈھاکہ شہر میں نواب سلیم اللہ کی کوششوں سے مسلمانوں کا ایک بڑا جلسہ ہوا جس کی صدارت نواب وقار الملک نے کی۔ جس میں پورے ہندستان سے مسلم لیڈران شریک ہوئے۔ مسلمانوں کے اس اجتماع میں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ اس طرح بنگال کی سرزمین (ڈھاکہ) سے مسلم لیگ کا جھنڈا تارا بن کر چمکا اور رفتہ رفتہ سارے ہندوستان میں لہرانے لگا۔ بنگال کے مسلم لیڈروں نے عام مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کا کام کیا اور انہیں نئے راستے پر لگادیا ورانہیں سمجھایا کہ دوسرے فرقہ کے لوگ مدت سے ان کی مذہبی روایات اور رسم و رواج کو دبانے اور کچلنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ اس لئے اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ وقت کے تقاضے اور دشمنوں کی چال کو سمجھیں اوران حالات کا مقابلہ کرنے کی سوچیں اور غیروں کے دباؤ میں آکر اپنی مذہبی شان کو داغدار نہ کریں۔

نواب سرسلیم اللہ کا تعلق ڈھاکہ کے مشہور نواب خاندان سے تھا۔ سرسلیم اللہ مرحوم کی کوششوں سے ہی مسلمانوں میں نئی روح بیدار ہوئی اور ان مسلمانوں کے اتحاد سے ہی مسلم لیگ کی نئی جماعت کامیابی سے ہم کنار ہوئی۔ نواب سلیم اللہ کا خاندان مغلیہ سلطنت کے زمانے ہی سے عزت اور رتبے کا مالک تھا۔ خواجہ ناظم الدین جیسی شخصیت بھی اسی خاندان سے تھی۔ اس خاندان کے بہت سے بزرگ اور نوجوان آج بھی بڑی خوبیوں اور اعلیٰ رتبوں کے مالک ہیں۔ آج مشرقی بنگال میں اردو ادب کو جو فروغ حاصل ہوا ہے وہ اسی خاندان کی اعلیٰ خدمات کا نتیجہ ہے۔

ABDIEL SOLUTIONS ABSOL

سرسلیم اللہ مسلم لیگ کے بانیوں اور محرکوں میں تھے ان کے علاوہ محسن الملک، وقار الملک، سرآغا خان، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور مولانا حسرت موہانی وغیرہ بھی مسلم لیگ کے بانیوں میں سے تھے۔ مسلم لیگ کے قیام کے بعد بھی مسلمان اس بات کی کوشش کرتے رہے کہ ہندوستان میں قومی شان سے زندہ رہیں اور اپنے

رسم ورواج کے مطابق ملک کے دوسرے فرقوں سے لڑائی جھگڑانہ کر کے آپس میں مل جل کر رہیں اور تمام فرقے آپس میں اتحاد واتفاق کی کوشش کریں۔

تحریک آزادی کی تاریخ میں ایک طویل مدت ایسی بھی گذری ہے کہ کانگریس اور مسلم لیگ میں شامل لوگ شانہ بہ شانہ مل کر اور متحد ہو کر برٹش گورنمنٹ کے خلاف ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔

1906 ء سے 1914 ء تک مسلم لیگ کے اجلاس ڈھاکہ، کراچی، امرتسر، دہلی، لکھنؤ، ناگپور، الہ آباد اور لاہور وغیرہ میں ہر سال پابندی کے ساتھ ہوتے رہے۔ اور ان میں مسلمانوں کے حقوق حاصل کرنے کی تجاویز کے ساتھ ہندو مسلم اتحاد کی تجاویز بھی پاس ہوتی رہیں۔ ادھر ہندو لیڈر گاندھی جی، موتی لال نہرو اور جواہر لال نہرو وغیرہ بھی مسلمانوں سے دوستی و ہمدردی کا اظہار کرتے رہے۔

نواب سلیم اللہ مرحوم اور آغا خاں کے انتقال کے بعد مسلم لیگ کی قیادت محمد علی جناح کے ہاتھوں میں آئی۔ جناح کی کامیاب قیادت کے نتیجہ میں گرچہ کانگریس سے مسلم لیگ کے راستے الگ ضرور ہو گئے لیکن تحریک آزادی پاکستان کے قیام کی تجاویز میں بھی اضافہ ہوا۔ بالآخر اگست 1947 ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کی متحدہ جدوجہد سے ملک آزاد تو ہو گیا لیکن تقسیم کی صورت میں ایک گہرا زخم بھی لگا گیا جو انگریزوں کی 'لڑاؤ اور حکومت کرو' کی پالیسی کا حصہ تھا۔ اس طرح انگریز اس پالیسی میں کامیاب رہے۔

مشقی سوالات

1. مسلم لیگ کے قیام کے اسباب پر روشنی ڈالیے۔
2. محمد علی جناح کی شخصیت سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجیے۔

خلافت تحریک

خلافت تحریک ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی تاریخ کا ایک اہم حصہ تھی۔ جس کے محرک بنیادی طور پر ہندوستانی مسلمان تھے۔ خلافت تحریک کا اپنا ایک تاریخی پس منظر تھا۔ پہلی عالمی جنگ کے نتیجہ میں ہندوستانی مسلمان مشرق وسطیٰ کے واقعہ سے زیادہ دلچسپی لے رہے تھے۔ عالمی جنگ کو وہ اسلام کے خلاف سازش سمجھ رہے تھے۔ عالمی جنگ کے نتیجہ میں ترکی سلطنت کے ٹکڑے ہو گئے تھے۔ ترکی کا سلطنت عالم اسلام کا خلیفہ بھی سمجھا جاتا تھا اس لیے ساری دنیا کے مسلمان ترکی کے خلیفہ سے جذباتی وابستگی رکھتے تھے۔

1914ء میں گاندھی جی کو انگلستان سفر کے دوران عیسائیت اور اسلام کی کشمکش کا اندازہ ہو گیا تھا جس نے سیاسی طور سے ہندوستانی مسلمانوں میں ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ مسلم لیڈران نے گاندھی جی سے خلافت کے مستقبل کے بارے میں ان کی رائے جاننی چاہی، گاندھی جی نے اپنے مسلمان ہم وطنوں کو صبر سے کام لینے اور گہری مایوسیوں کے باوجود تشدد کے ہر خیال کو دل سے نکال دینے کا مشورہ دیا۔ مولانا محمد علی تحریک خلافت کے اہم لیڈروں میں تھے۔ نومبر 1918ء میں جنگ کے خاتمے پر خلافت کا مسئلہ تحریک کی شکل اختیار کر گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شکست خوردہ ترکی سلطنت سے تھریس کے علاوہ عرب صوبے اور ایشیائے کوچک کے بہترین حصے چھین لیے جائیں گے۔ ترکی کا سلطان اب عالم اسلام کے خلیفہ کی حیثیت سے کام نہیں کر سکتا تھا۔ اسی صورت حال میں دسمبر 1919ء میں مولانا محمد علی اور ان کے بھائی مولانا شوکت علی کی رہائی ہوگئی جس کے نتیجہ میں خلافت تحریک میں ایک نئی جان پڑ گئی اور تحریک خلافت کے اعلیٰ رہنماؤں کی ایک میٹنگ ہوئی جس میں گاندھی جی کو بھی مدعو کیا گیا۔ گاندھی جی نے خلافت تحریک کے موضوع پر ایک مرکزی کمیٹی بنانے کی تجویز پیش کی جو مولانا ابوالکلام آزاد، حکیم اجمل خاں اور گاندھی جی پر مشتمل تھی۔

فروری 1920ء میں کلکتہ میں مولانا آزاد کی صدارت میں ایک خلافت کانفرنس ہوئی۔ اسی دوران ترکی

سے انگریزوں کے صلح نامہ کی اشاعت نے مسلمانوں میں مزید بے چینی پیدا کردی۔ ترکی سے اس نرمی کا برتاؤ نہیں کیا گیا جس کی مسلمان توقع رکھتے تھے اور جس کے لیے وہ برابر جدوجہد کررہے تھے۔ الٹے وائسرائے نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے ہم مذہب ترکوں کے زوال کو صبروسکون کے ساتھ برداشت کرلیں۔ ہندوستان کو یہ طفل تسلی معلوم ہوا۔ اس تسلی سے ہندوستانی مسلمان حددرجہ مایوس ہوگئے۔ وہ فوری طور پر خلافت کے مسئلہ پر کچھ نہ کچھ کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے جون 1920ء میں الہ آباد میں خلافت کمیٹی کا ایک جلسہ ہوا جس میں متفقہ طور پر گاندھی جی کی عدم تعاون تحریک کو منظوری دی گئی۔ بلکہ گاندھی جی کو یہ بھی اختیار دیا گیا کہ وہ خلافت کے موضوع پر وائسرائے ہند سے بات کریں۔ گاندھی جی نے نہ صرف یہ کہ وائسرائے سے بات کی بلکہ کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں بھی خلافت کے مسئلہ کو اہم موضوع بنا کر پیش کیا اب تحریک خلافت کی قیادت بہت حد تک گاندھی جی کے ہاتھوں میں آچکی تھی۔ چونکہ گاندھی جی نے تحریک خلافت سے ہمدردی اور معاونت کا وعدہ کیا تھا۔ چنانچہ 20/جنوری 1920ء کو دہلی میں ایک جلسہ ہوا جس میں لوک مانیہ تلک اور دوسرے کانگریسی لیڈران بھی شریک ہوئے اور سبھوں نے مسلمانوں کے موقف خلافت کے ساتھ اپنی مدد کا وعدہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خلافت کے مسئلہ پر ہندومسلمان میں کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوا۔ خلافت تحریک کی یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔ وائسرائے اور لندن صلح کانفرنس میں وفد لے جانے کے بارے میں جو تجاویز مولانا آزاد اور علی برادران کے قیدوبند کے بارے میں منظور ہوئی تھیں۔ ان حضرات کی رہائی کے بعد ان پر دوبارہ غور کیا گیا اور طے پایا کہ خلافت کے موضوع پر ایک وفد لندن لے جایا جائے۔ مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں ایک وفد لندن گیا بھی لیکن گفتگو ناکام ہوگئی اور وفد کو بے نیل ومرام واپس لوٹنا پڑا۔

خلافت کمیٹی کے وفد کی ناکامی کے اسباب میں ایک سبب حکومت برطانیہ کی پالیسی خلافت تحریک کے تعلق سے ٹال مٹول اور لیپا پوتی کی تھی، خلافت ترکی کی معزولی کے تعلق سے برطانیہ میں عام طور سے یہ بات کہی جاتی تھی کہ جو سلوک ترکوں کے ساتھ کیا گیا وہ اس سے زیادہ کے حقدار نہیں تھے۔ ہندوستان میں وائسرائے اپنی نجی محفلوں میں اس حقیقت کو تسلیم کرتے تھے کہ ترکوں کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے لیکن چونکہ برطانیہ حکومت کی اعلی پالیسی کا مسئلہ تھا اس لیے وہ خاموشی میں ہی اپنی عافیت سمجھتے تھے۔ اس سلسلے میں گاندھی جی کا جواب یہ تھا کہ

وائسرائے کو ہندوستانی مسلمانوں کی خلافت تحریک کی سربراہی کر کے اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔

گاندھی جی نے ہندوؤں سے بھی اپیل کی کہ ایک برادر وطن جماعت کا ان پر بھی حق ہے۔ اور وہ اس فرض کو پورا کریں۔ ان کا دکھ ہمارا دکھ ہے پھر صدیون تک ہندو مسلم اتحاد کا یہ سنہرا موقع ہاتھ نہیں آئے گا۔ انہوں نے اس حقیقت کو تسلیم کرلیا کہ خلافت خالص مسلمانوں کا ایک بین الاقوامی مسئلہ ہے۔ لیکن جہاں تک ہندوستانی مسلمانوں کا تعلق ہے تو تحریک خلافت ہندوستان کی آزادی سے بھی جڑا ہوا مسئلہ ہے۔ ایک غلام ہندوستان مظلوم جو خود آزاد نہیں ہے وہ ترکی کی مدد کیسے کرسکتا ہے؟ ایک مفلوج انسان دوسروں کے لیے کیا کرسکتا ہے اگر وہ کچھ کرسکتا ہے تو اسے پہلے اپنے فالج سے نجات حاصل کرنا چاہیے۔

جب انڈین نیشنل کانگریس نے اپنے ستمبر 1920ء کے خصوصی اجلاس میں عدم تعاون تحریک کے پروگرام کو منظور کرلیا تو گاندھی جی لازمی طور پر قومی تحریک عدم تعاون اور خلافت تحریک دونوں کے قائد بن گئے۔ انہوں نے خلافت کے موضوع پر مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی دونوں کے ساتھ پورے ہندوستان کا دورہ کیا۔ اس وقت ہندو مسلم اتحاد اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گیا۔ گاندھی جی کی بات ہندو اور مسلمان دونوں دھیان سے سنتے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کا ایسا نظارہ تحریک آزادی کی تاریخ میں کبھی نہیں دیکھا گیا۔

نتائج کے اعتبار سے گرچہ تحریک خلافت کو ناکام ہی کہا جائے گا لیکن مقاصد کے اعتبار سے اس تحریک نے بہت حد تک کامیابی حاصل کرلی۔ خلافت تحریک کے ذریعہ ہی ملک کے ہندو اور مسلمانوں نے بے مثال اتحاد کا مظاہرہ کیا جس کی وجہ سے تحریک خلافت کو آزادی کی تاریخ کا ایک روشن باب کہا جاسکتا ہے۔

مشقی سوالات

1. تحریک خلافت کے پس منظر پر روشنی ڈالیے۔
2. کیا خلافت تحریک کو ہندوستان کے دیگر فرقوں کے درمیان مقبولیت حاصل ہوئی؟

ABDIEL SOLUTIONS ABSOL PATNA

ترک موالات

1919ء کے جلیان والا باغ گولی کانڈ سے گاندھی جی سمیت تمام کانگریسی رہنما ناراض ہوگئے۔ اس خوں چکاں واقعہ سے ہندوستانی عوام میں ناراضگی پھیل گئی۔ اس ناراضگی کے نتیجہ میں گاندھی جی نے ترک موالات تحریک شروع کرنے کا فیصلہ لیا۔ تو بہار کانگریس نے بھی ستمبر 1920ء سے پہلے ترک موالات تحریک کی حمایت کا اعلان کردیا اور تحریک میں پر جوش اور سرگرم حصہ لیا۔ 31/ جولائی 1920ء کو بہار کی صوبائی کانگریس کمیٹی نے عدم تعاون کے اصول کو عملاً بھی تسلیم کرلیا اور کمیٹی کے اس فیصلے کو اگست 1920ء کی بہار صوبائی کانفرنس نے بھاگلپور اجلاس میں تجویز کے طور پر منظوری دے دی۔ کلکتہ میں کانگریس کے خاص اجلاس میں قومی تحریک کے لیے جو پروگرام مرتب کیے گئے بہار کانگریس نے اس پروگرام پر بے خوفی کے ساتھ عمل کیا۔ گاندھی جی نے جب دسمبر/1920ء میں بہار کا دورہ کیا تو بہاری کانگریسیوں کی ان کاموں سے بڑی حوصلہ افزائی ہوئی۔ اس طرح ترک موالات کی تحریک صوبہ بہار کے چپہ چپہ میں پھیل گئی۔ بہت سارے بہاریوں نے سرکاری ملازمتوں کو خیر باد کہہ دیا۔ وکلاء نے وکالت کے پیشہ کو چھوڑ دیا۔ طلبہ نے سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں جانا چھوڑ دیا۔ اس تحریک نے بہار میں اس قدر زور پکڑلیا کہ اپریل 1921ء میں پٹنہ، پورنیہ، مونگیر اور چمپارن ضلعوں میں پولس نے ہڑتال کردی۔ جن گرفتار شدگان پر عدالتی کارروائی ہورہی تھی وہاں عدالت کے اندر اور باہر زوردار مظاہرے ہوئے۔ ملک کے سوراج فنڈ میں بہاریوں نے دل کھول کر چندہ دیا۔ یہاں تک کہ بہاری عورتوں نے اپنے جسم سے زیور نکال کر دینا شروع کردیا۔ 17 /نومبر 1921ء کو جب پرنس آف ویلس نے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا پھر 22/ 23 /نومبر کو جب وہ پٹنہ تشریف لائے تو پٹنہ شہر کے دکانداروں نے پرنس آف ویلس کے خلاف ناراضگی و نفرت کے اظہار کے لیے احتجاجاً اپنی دکانیں بند رکھیں۔ برٹش گورنمنٹ نے کانگریسی کارکنوں کی ایک بڑی تعداد کو گرفتار کرلیا اور 1922ء میں گاندھی جی کو بھی گرفتار کرکے جیل بھیج دیا گیا۔

1922ء میں گیا میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک یادگار اجلاس ہوا جس کی صدارت دیش بندھو چترنجن داس نے کیا۔ اس تاریخی اجلاس میں متفقہ طور پر یہ تجویز پاس ہوئی کہ قانون ساز اداروں میں داخلہ کے لیے کانگریس کو انتخاب لڑنا چاہیے۔ کانگریس کے گیا اجلاس کے بعد ڈاکٹر راجندر پرشاد کو ہی آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا صدر منتخب کیا گیا اور جب تک ڈاکٹر راجندر پرشاد کانگریس کے صدر رہے۔ کانگریس کا مرکزی دفتر پٹنہ میں ہی رہا۔ادھر رانچی کے تانا بھگت لوگ بھی گیا کے کانگریس اجلاس سے بہت متاثر ہوئے اور ترک موالات تحریک کو نہایت شدت سے آگے بڑھایا۔

ناگپور میں جب گاندھی نے ستیہ گرہ شروع کیا تو اس میں بھی بہار کے لوگوں نے نہایت جوش اور سرگرمی سے حصہ لیا۔ یہاں تک کہ ہزاروں کانگریسی رضا کار بہار سے مہاراشٹر چلے گئے۔ ان بہاری رضا کاروں کی قیادت ڈاکٹر راجندر پرشاد کرر ہے تھے۔ اسی دوران ایک نئی سیاسی پارٹی کا قیام عمل میں آیا۔ جس کا نام 'سوراج پارٹی' رکھا گیا۔ سوراج پارٹی کے قیام کا مقصد ہی قانون ساز اسمبلی کے انتخاب میں حصہ لینا تھا۔ چنانچہ اس پارٹی نے قانون ساز اسمبلی کے انتخاب میں سرگرم حصہ لیا۔ ابتدائی طور پر میونسپلٹی اور ضلع بورڈوں کے انتخاب میں کانگریسی امیدواروں کو زبردست اکثریت حاصل ہوئی۔

5رفروری 1924ء کو برٹش گورنمنٹ نے گاندھی جی کو جیل سے رہا کردیا۔ اسی سال گاندھی جی آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے۔ اس وقت تک ترک موالات کی تحریک عملاً ختم ہوچکی تھی۔ اب گاندجی کے تعمیری اور مثبت کاموں کے پروگرام پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ اس موقع سے گاندھی جی کانگریس میں واحد طاقت ور رہنما بن کر ابھرے۔ اب ان کے مقابلہ میں کوئی رہنما نہیں رہا۔ گاندھی جی کے اس تعمیری پروگرام میں بہار کے لوگوں کی خدمات قابل قدر ہیں۔ اب کھادی کپڑوں کے استعمال پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ کھادی کا کپڑا بنانے کے لیے چرخہ کا استعمال کیا گیا۔ بہار میں ہزاروں مقامات پر چرخہ پر کھادی کے کپڑے بنے جانے لگے۔ بھاگلپور کپڑے کی صنعت میں ہینڈلوم اور پاورلوم اسی چرخے کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ کھادی کی صنعت کے لیے صوبہ بہار ایک اہم مرکز بن گیا۔ یہاں تک کہ 1925ء میں پٹنہ میں سوت تیار کرنے والے تاجروں کی ایک آل انڈیا تنظیم قائم ہوئی۔ اس طرح بہار والوں نے تحریک آزادی سے متعلق تمام پروگرام کو بشمول ترک موالات اپنے جذبۂ ایثار

وقربانی سے کامیاب بنانے میں اہم رول ادا کیا۔

مشقی سوالات

1. جدوجہد آزادی کے پس منظر میں تحریک ترک موالات سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجیے۔
2. تحریک ترک موالات کی تاریخی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔

تحریک عدم تعاون

تحریک آزادی کی تاریخ میں1920 ءایک تاریخ ساز سال رہا ہے۔ گاندھی جی جو اب تک برٹش گورنمنٹ اورعوام سے ہر مرحلے میں تعاون کرتے رہے۔ اب انہوں نے اچانک گورنمنٹ سے عدم تعاون کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس فیصلہ نے رفتہ رفتہ تحریک کی شکل اختیار کر لی جسے آزادی کی تاریخ میں عدم تعاون تحریک کے نام سے جانا جاتا ہے۔

عدم تعاون تحریک کے دو تاریخی اسباب تھے۔ اول یہ کہ خلافت کے معاملے میں برٹش گورنمنٹ نے مسلمانوں سے وعدہ خلافی کی۔ دوسرے یہ کہ پنجاب کے واقعات خصوصاً جلیان والا باغ گولی کانڈ میں انگریزوں نے تحقیق کے لیے ہنٹر کمیشن قائم تو کیا لیکن لیپا پوتی کر کے واقعات کی نزاکت کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ ان واقعات کا گاندھی جی کے ذہن پر بہت زبردست اثر پڑا اور نتیجہ یہ ہوا کہ برٹش گورنمنٹ سے گاندھی جی کا اعتماد ختم ہوگیا اور انہوں نے مجبور ہو کر گورنمنٹ کے خلاف عدم تعاون تحریک چلانے کا فیصلہ کیا۔

27 رمئی 1920 ءکو ہنٹر کمیشن کی رپورٹ شائع ہوئی جس میں ہندوستانی مظلومین کے مفادات کو مکمل طور پر نظر انداز کیا گیا اور انگریزوں کے مظالم سے چشم پوشی کی گئی۔ رپورٹ کی اشاعت کے دو دنوں کے بعد 30 رمئی 1920 ءآل انڈیا کانگریس کمیٹی کی ایک میٹنگ بنارس میں ہوئی جس میں سخت احتجاجی تجاویز منظور کی گئیں اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ اہم قومی امور پر غور کرنے کے لیے کانگریس کا ایک خصوصی اجلاس بلایا جائے۔ مہاتما گاندھی کا ارادہ تھا کہ عام اجلاس میں قومی لیڈروں کے سامنے عدم تعاون تحریک کے اغراض و مقاصد کو تفصیل سے بیان کیا جائے۔ چنانچہ 2 رجون 1920ء کو الہ آباد میں ایک خصوصی اجلاس بلایا گیا۔ شریک کار رہنماؤں نے اجلاس کے پروگرام کو منظوری دے دی۔ اجلاس کی تفصیلات تیار کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی۔ کمیٹی نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ عدم تعاون تحریک کے پہلے مرحلہ کے طور پر اسکولوں، کالجوں اور عدالتوں کا بائیکاٹ کیا جائے۔

ادھر آل انڈیا خلافت کمیٹی نے بھی گاندھی جی کی قیادت میں عدم تعاون تحریک میں شامل ہونے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اب عدم تعاون تحریک کا خاکہ پورے ملک کے سامنے پیش کردیا گیا اور یکم اگست 1920ء کو گاندھی جی نے اس تحریک کا باضابطہ آغاز کیا۔ اس سلسلے میں گاندھی جی اور علی برادران نے پورے ملک کا طوفانی دورہ کیا اور عوام کے سامنے تحریک کی تفصیلات پیش کیں اور تحریک کی حمایت میں رائے عامہ تیار کیا۔ عدم تعاون تحریک پر عمل کرنے کے لیے صوبائی کانگریس کمیٹیوں سے بھی رائے مانگی گئی تھی۔ سبھی کمیٹیوں نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے فیصلوں کی تائید تحریری طور پر کردی۔ برٹش گورنمنٹ کو اس کی غلطی کا احساس دلانے کے لیے ستمبر 1920ء میں کلکتہ میں کانگریس کا ایک عام اجلاس بلایا گیا۔ اس اجلاس میں ہنٹر کمیشن کی ایک طرفہ رپورٹ پر ناراضگی کا اظہار کیا گیا اور برٹش گورنمنٹ کی ہٹ دھرمی والی پالیسی پر عوام کی ناراضگی اور عدم تعاون تحریک کے تعلق سے تجاویز پیش کی گئیں اور ہنٹر کمیشن کی رپورٹ کو ناقابل قبول قرار دے دیا گیا۔ تجاویز پر گرما گرم بحث شروع ہوگئی اگرچہ اکثریت نے تحریک کی حمایت میں رائے دی لیکن اس اجلاس میں بعض کانگریسی عدم تعاون تحریک کے مخالف بھی تھے۔ چنانچہ ان مخالفین نے تحریک عدم تعاون کی تجویز کی مخالفت بھی کی۔

قرارداد میں مزید یہ بھی کہا گیا کہ مخالفت کے باوجود ہندوستانی عوام کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ گاندھی جی کی عدم تعاون پالیسی کو اختیار کیا جائے تاکہ برٹش گورنمنٹ کی غلطیوں کا ازلہ کیا جائے اور سوراج قائم کیا جائے۔ عدم تعاون تحریک کو عملی جامہ پہنانے کے لیے درج ذیل اصول طے کیے گئے:

1. خطابات و اعزازات لوٹائے جائیں اور مقامی اداروں کے ممبران استعفیٰ دیں۔
2. حکومت کے دربار میں شرکت نہیں کی جائے۔
3. طلبہ کو سرکاری اسکولوں سے ہٹایا جائے۔
4. وکیل اور مدعی برطانوی عدالتوں کا بائیکاٹ کریں۔
5. فوجی کلرک اور مزدور اپنی خدمات کا بائیکاٹ کریں۔
6. اصلاح شدہ کاؤنسلوں سے امیدوار اپنی امیدواری واپس لیں اور ووٹر ووٹ نہ دیں۔
7. غیر ملکی اسکولوں کا بائیکاٹ کیا جائے۔ سودیشی کپڑوں کا استعمال کیا جائے اور اگر یہ کپڑا نہ ملے تو گھر گھر

چرخے کو رواج دیا جائے۔

مہاراشٹر اور بنگال صوبے کو چھوڑ کر پورے ملک سے عدم تعاون تحریک کو حمایت حاصل ہوئی۔ مذکورہ بالا اصولوں پر سختی سے عمل کیا گیا خصوصاً ملک کے نوجوان طبقہ نے تحریک کو جوش و خروش کے ساتھ اپنا عملی تعاون پیش کیا۔

1924ء میں ملک کی تمام علاقائی پارٹیوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے گاندھی جی اور جواہر لال نہرو نے متفقہ فیصلہ کیا کہ ملک کے مفاد میں اور جلد آزادی حاصل کرنے کے مقصد کے پیش نظر عدم تعاون تحریک کو معطل کر دیا جائے۔

مشقی سوالات

1. تحریک عدم تعاون کی نوعیت پر اظہار خیال کیجیے۔
2. عدم تعاون تحریک کی روشنی میں گاندھی جی کی شخصیت کا جائزہ لیجیے۔